فخر الدین احمد فخر یار جنگ ۔ حالات و افکار

نواب مشتاق احمد خاں ☆

مشرقی پنجاب کے مردم خیز خطے ضلع جالندھر میں ریلوے لائن پر شہر سے کوئی آٹھ میل دور دھوگڑی نام کی ایک قدیم بستی تھی جہاں لودہی پٹھانوں کی ایک شاخ کئی پشتوں سے آباد تھی ۔ اُن میں سے کئی باکمال بزرگ پیدا ہوئے جنھوں نے انگریزی حکومت کی سختیوں کے باوجود اپنی شخصیت اور کردار کے اَن مِٹ نقوش چھوڑے ۔ ۱۸۸۳ء میں اسی بستی میں فخر الدین احمد کی یگانہ روزگار ہستی وجود میں آئی جس نے اپنے بزرگوں سے بھی بڑھ کر خاندان کا نام روشن کیا ۔ دنیاوی زندگی میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے اعلیٰ ترین مدارج حاصل کیے لیکن دنیا کمانے کے ساتھ ساتھ دینی دولت بھی بھرپور انداز میں کمائی ۔ شریعت محمدی کی پابندی اپنی زندگی کا اہم ترین اصول بنایا اور اخلاق حسنہ کا اعلیٰ معیار قائم کیا ۔

ان کی ابتدائی تعلیم شہر سیالکوٹ میں ہوئی جہاں ان کے والد بزرگوار افسر مال کے عہدہ پر فائز تھے ۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے والد اور چچا کے سرسید احمد خان سے گہرے دوستانہ مراسم کی وجہ سے وہ کالج کی تعلیم کے لیے مدرستہ العلوم علی گڑھ بھیجے گئے ۔ اس اقدام سے اُن کے خاندان کی اُس عظیم الشان مادرِ علمی سے ۵۱ سال کے طویل اور مسلسل تعلق اور رابطہ کی بنیاد پڑی ۔ علیگڑھ میں وہ ایک ذہین، محنتی اور سنجیدہ مزاج کے طالبعلم سمجھے جاتے تھے ۔ انہی خصوصیات کی بنا پر وہ اپنے اساتذہ اور ساتھیوں میں بہت مقبول تھے ۔ علیگڑھ کے پورے عرصۂ تعلیم میں سرسید احمد خان ان کے سرپرست تھے اور اُنہی سے وہ تعلیمی اور غیر تعلیمی معاملات میں رہبری حاصل کرتے تھے ۔ طلباء میں اُن کی شہرت ایک پابندِ صوم و صلوٰۃ نوجوان کی تھی ۔ مذہب سے ان کو اتنا شغف تھا کہ بی ۔ اے میں عربی کا مضمون انھوں نے اس لیے منتخب کیا تا کہ قرآن کریم، حدیث اور فقہ کی کتب کا خود آسانی سے مطالعہ کر سکیں ۔ بی ۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ اپنے والد جو اُس وقت ریاست کشمیر میں مشیر مال کے عہدہ پر فائز تھے کے سرکاری اور نجی کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے ۔ . پ نے اپنے اثر و رسوخ سے بیٹے کے لیے ایک معقول ملازمت کے لیے بہت بھاگ دوڑ کی مگر کامیابی نہیں ہوئی ۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنے والد کی ایسی والہانہ

☆ سابق سفیر مملکت حیدرآباد دکن برائے پاکستان

انداز میں خدمت کی کہ باپ نے بیٹے کو سینے سے لپٹا کر کہا ''بیٹا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ مگر میں تم سے بہت خوش ہوں۔ ایک خوش باپ کی دعا رایگاں نہیں جا سکتی تم انشاء اللہ بہت ترقی کرو گے۔'' باپ کی یہ دعائیہ پیشنگوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

فخر الدین احمد کی عمر ابھی ۲۲ برس کی تھی کہ اُن کے والد ہندو ریاست کی سازشوں کا شکار ہو کر رحلت فرما گئے اور انھیں کم عمری میں ساری خاندانی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں۔ تین چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت محدود وسائل کی وجہ سے ایک کٹھن مسئلہ تھی۔ مگر وہ تھوڑی سی جائیداد کو سنبھالنے اور سنوارنے میں ایسے جُت گئے کہ وہ مالی اور دیگر مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۰۷ء میں وہ انڈین آڈٹ اور اکاؤنٹس سروس سے منسلک ہو گئے۔ جس میں وہ ۴ برس تک پہلے لاہور میں اور پھر الہ آباد میں فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی دوران انھیں سوءِ ہضمی کی شکایت ہو گئی۔ یہ کوئی خاص خطرناک بیماری نہیں تھی۔ مگر ان کی طبیعت بڑی حساس تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ سو فیصد تندرستی ملازمت کی شرطِ اولین ہے۔ جب یہ صورت حال نہیں ہے تو انہیں ملازمت سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور گاؤں میں واپس آ کر کاشت کاری کا کام شروع کر دیا۔ اُن کی محنت اور جدت پسند طبیعت نے اس پسماندہ گاؤں کو جدید زراعت کے تجربوں سے تمام صوبے میں مشہور کر دیا۔ وہ خود تو اس صورت حال سے مطمئن تھے مگر اصل خاندان اور احباب کا اُن کا ملازمت سے اس طرح سبکدوش ہونا پسند نہیں تھا اور وہ برابر اُن پر زور دیتے رہے کہ وہ دوبارہ کوئی سرکاری ملازمت اختیار کر لیں۔ وہ برابر ٹالتے رہے مگر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ انھیں ویسا ہی کرنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے باپ کی دعا قبول ہو چکی تھی اور مشیت الہیٰ یہی تھی کہ وہ ایک بار پھر ملت اسلامیہ کی خدمت کریں۔

نظام حیدر آباد کو ایک ماہرِ فن حساب کی ضرورت پڑی۔ فخر الدین احمد کو پہلی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۴ برس ہو چکے تھے۔ مگر ان کی اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد پر اس ملازمت کے لیے حکومتِ ہند نے انھیں نامزد کر دیا۔ حیدر آباد میں جا کر انھوں نے بڑی تیزی سے ترقی کے مراحل طے کیے اور تین چار برس میں حیدر آباد کے محکمۂ حساب کے سربراہ بن گئے۔ پھر تو جیسے بند راستہ کھل گیا۔ پہلے معتمد مالیات کے عہدہ پر ترقی پائی اور اس عہدہ پر مسلسل ۱۶ برس تک فائز رہے۔ اگر وہ اپنے ماحول سے سمجھوتہ کر لیتے تو شاید تین چار برس میں وہ وزیر مالیات بن جاتے۔ مگر ان کی اصول پسندی اور حق گوئی ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہو گئی۔ ان سولہ برسوں میں وہ مدت تک کارآموز

وزیر مالیات تو بنے مگر اس عہدہ پر مستقل ترقی میں کئی برس کی تاخیر ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ایک درباری نورتن جوان کا ہمسایہ تھا کسی وجہ سے حاکم وقت کا معتوب ہوگیا۔ درباری آداب کا تقاضہ تھا کہ بادشاہ کے عتاب میں آنے والے ہر شخص سے آنکھیں پھیر لے۔ اسی اثنا میں معتوب نورتن کا انتقال ہوگیا۔

چناں چہ حاکم وقت کے ڈر سے دوست احباب عزیز و اقارب نے نہ اس کے جنازے میں شرکت کے لیے آئے نہ اس کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا۔ فخر الدین احمد کی اسلامی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ایک مسلمان کا جس کے ان پر ہمسائیگی کے حقوق بھی تھے جنازہ نہ پڑھیں۔ اور اس کے پسماندگان کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ دیں۔ چناں چہ وہ نہ صرف اس کے جنازے میں شریک ہوئے بلکہ تجہیز و تکفین کی ساری ذمہ داری اٹھائی اور پورا ایک ہفتہ سات دن اس غمزدہ خاندان سے اظہار ہمدردی کے لیے موجود رہے۔ یہ ایک غیر معمولی جرأت مندانہ اقدام تھا جو دنیاوی اعتبار سے انھیں کافی نقصان پہنچا سکتا تھا مگر انھوں نے نتائج اور عواقب سے بے پرواہ ہو کر وہی کیا جو ایک غیرت مند مسلمان کو کرنا چاہیے تھا۔ اسی زمانہ میں ان کا نام مستقل وزا ت کے لیے زیر غور تھا۔ اس واقعہ کے بعد شاہی عتاب عہدہ میں متوقع ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گیا اور جس وزارت پر وہ صرف ۸ سال کی ملازمت میں فائز ہونے والے تھے اس کے ملنے میں کئی برس کی تاخیر ہوگئی۔ اس کا انھیں ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے بزرگوں نے اپنے اصول کی خاطر اور ضمیر کی آواز پر بڑی قربانیاں دی ہیں۔ عہدہ میں ترقی رک جانا ان کی نظر میں ایسی بڑی قربانی نہیں بلکہ ایسی ترقی جو ضمیر کشی سے حاصل کی جائے بہت مہنگا سودا ہے۔ مطلق العنانی چاہے وہ ملوکیت کی شکل میں ہو یا جمہوری تماشہ کی شکل میں وہ حق گوئی اور دیانتدارانہ اظہارِ خیال پر قدغن لگاتی ہے۔ چناں چہ حیدرآباد میں بھی بادشاہ وقت کے سامنے اس کی مرضی اور رجحان کے خلاف اظہارِ رائے کرنا دل گردے کا کام تھا۔ لیکن انھوں نے پورے دوران ملازمت بڑی جرأت مندی سے بادشاہ کی مرضی کے خلاف حق گوئی سے گریز نہیں کیا۔ یہ محض اللہ کا کرم تھا کہ کئی برس تک ان کے کردار کو پرکھنے کے بعد حضور نظام بالآخر ان کی شخصیت اور کردار سے متاثر ہوگئے۔ اور انہیں کئی قسم کی مراعات اور القابات سے نوازا جس میں فخر یار جنگ کا خطاب بھی شامل تھا۔ اوپر کے واقعہ کی وجہ سے وزارت پر فائز ہونے میں تاخیر تو ہوگئی لیکن شاہی مزاج میں تبدیلی سے یہ سلسلہ چل پڑا۔ وہ علی الترتیب وزارتِ داخلہ، وزارتِ صنعت و حرفت و تجارت پر فائز ہوئے۔ پھر جب سر اکبر حیدری نے وزارت عظمیٰ پر ترقی پائی تو ان کی جگہ مستقل طور پر وزارت مالیات کا عہدہ سنبھالا۔ اس وزارت کے دور میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور شخصیت کے ایسے نقوش چھوڑے اور ایسی دوررس مالی

اصلاحات کیں کہ ان کا چرچا تمام ہندوستان میں ہوگیا۔

وہ ایک شریف اور پابندِ شریعت بزرگ تھے۔ نادانستگی اور بے خیالی میں کوئی چوک ہو جائے تو اور بات مگر دانستہ طور پر خلاف شریعت کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ حیدرآباد کی محافل میلاد میں اکثر و بیشتر وہی صدارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ایک محفل میں صدارت کررہے تھے کہ اچانک حضور نظام وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھ کر حاضرین محفل بطور احترام کھڑے ہو گئے اور اپنی دستار ٹھیک کرنے لگے۔ فخر الدین احمد نے مسند صدارت سے رسول کریمؐ کی اس محفل میں اس خلافِ ادب رویہ کا سختی سے نوٹس لیا اور بلند آواز میں کہا ''یہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل ہے اس میں کسی اور شخص کا احترام کرنا گستاخی اور بے ادبی ہے۔ حضور نظام اس محفل سے باہر ہمارے شاہ ذی جاہ ہیں۔ اس محفل میں سرورِ کائنات کے ایک غلام ہیں۔ آپ لوگ جہاں بیٹھے ہیں ادب واحترام سے بیٹھے رہیں۔ یہ کلمات بڑے خطرے کا باعث ہو سکتے تھے۔ حضور نظام تو اس جرأت مندانہ للکار کو سن کر خاموش ہو گئے مگر درباریوں نے انہیں بہت مشتعل کرنے کی کوشش کی۔ مگر نظام الدین دینی مزاج والے سمجھ دار آدمی تھے وہ اس دن سے اوران کی عزت کرنے لگے۔ فخر یار جنگ کا خطاب بھی اس واقعہ کے چند روز بعد ظہور پذیر ہوا۔

وہ دوبار حج بیت اللہ شریف اور روضۂ نبویؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پہلی مرتبہ جب مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی تو وہ پیر علیؒ سے زاروقطار روتے ہوئے مواجہ شریف میں پہنچے اور بڑی دیر تک وفورِ جذبات سے مغلوب ہوکر عالمِ استغراق میں گم سم کھڑے رہے۔ ایک بار کسی نے ان سے پوچھا کہ انھوں نے مسجد نبویؐ میں کندہ وہ کتبے تو دیکھے ہوں گے۔ ان کا جواب تھا'' میں تو اس آستانہ پاک میں سر جھکائے اور نیچی نظریں کئے ہوئے اور اپنی کوتاہیوں پر ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے سلام کے لیے جاتا ہوں۔ مجھ میں اتنی جسارت کہاں کہ نظریں اٹھا کر دیکھوں کہ اس کی دیواروں اور چھت پر کیا لکھا ہے۔''

انھیں علماء کرام اور بزرگان ملت سے ملنے اور ان سے فیض حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ چناں چہ ہر روز شام کو دفتری اوقات کے بعد مغرب کی نماز تک کسی نہ کسی بزرگ کی صحبت میں صرف کرتے تھے اور اگر کسی بزرگ کی آمد کی خبر اخبار یا کسی اور ذریعہ سے ملتی تھی تو وہ خود اس کی پذیرائی کے لیے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاتے تھے اور ان کی جائے قیام تک ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اس طرح وہ ہندوستان کے ہر علاقہ سے آنے والے بزرگوں سے متعارف تھے۔ کئی رفاہی اداروں سے وابستگی تھی اور انکی دیکھ بھال کے لیے اپنے مصروف اوقات میں

سے وقت نکال لیتے تھے۔ خدمت خلق کو وہ عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ باری تعالیٰ کی عبادت کا صحیح معنوں میں اسی وقت حق ادا ہوسکتا ہے جب اس کی مخلوق کی خدمت کا جذبہ بھی ہو۔ اور وہ جذبہ ساری عمر جاری و ساری رہے۔ ایک مرتبہ حیدرآباد میں طاعون کی وبا ایسی پھیلی کہ دیکھتے دیکھتے سارا شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایسی مہلک وبائی بیماری میں عموماً عزیز و اقارب حتیٰ کہ بھائی بہن بھی الگ ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ حیدرآباد میں یہی ہوا۔ صورتِ حال اتنی خراب ہوگئی کہ مردوں کے جنازے اٹھانے والے بھی مشکل سے ہی ملتے تھے۔ فخرالدین احمد کا جذبۂ خدمت خلق اتنا گہرا تھا کہ باوجودیکہ وہ اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے وہ چند رضا کاروں کو ساتھ لے کر متاثرہ محلوں میں مریضوں کی عیادت کے لیے جاتے تھے، ان کے علاج کا انتظام کرتے تھے اور لاوارث مردوں کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرتے تھے۔

وہ ایک خود دار انسان تھے۔ انھوں نے سارے عرصۂ ملازمت میں کسی کے سامنے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لیے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ دیانت کا یہ عالم تھا کہ دفتری اغراض کے لیے آئے ہوئے کاغذ اور سیاہی کو ذاتی کام کے لیے بھی استعمال نہیں کیا۔ مسلمانوں میں باہمی اخوت اور اتحاد کے دل و جان سے حامی تھے۔ اگر مسلمان معاشرہ میں کبھی اختلاف یا نفرت کے آثار دیکھتے تھے تو انہیں روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ چناں چہ اسی جذبہ کے تحت انھوں نے پنجابی جو ان کی مادری زبان تھی کی بجائے اردو زبان کو مستقل طور پر اپنا لیا۔

ایک مرتبہ جب کسی نے پوچھا کہ جب وہ ٹھیٹھ پنجابی بول سکتے ہیں تو پھر ہر وقت اردو کیوں بولتے ہیں۔ ان کا جواب تھا ''مسلمانوں میں پہلے کیا کوئی کم اختلافات ہیں جو میں ان میں اپنی طرف سے ایک اور کا اضافہ کروں۔'' انگریزی زبان کو وہ بوقت ضرورت ہی استعمال کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انگریزی الفاظ کی تقریر و تحریر میں اتنی بھرمار نہیں تھی جتنی بدقسمتی سے آج کل ہے۔ وہ اس زمانہ میں بھی اردو زبان کی کھچڑی، بنانے کے سخت مخالف تھے۔ حیدرآباد میں اردو زبان کو اس کا صحیح مقام دلانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ اپنی وزارت کے دوران انھوں نے حیدرآباد میں انگریزی کی بجائے اردو میں بجٹ (موازنہ) پیش کرنے کی رسم جاری کی۔ الہ آباد میں مختصر دور کے بعد انھوں نے کبھی انگریزی لباس نہیں پہنا۔ یہ گریز کسی تعصب کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ اسلام میں لباس کے لیے دو اہم لوازمات ہیں۔ طہارت اور ستر۔ جو لباس بھی ان لوازمات کو پورا کرتا ہے وہ قابلِ قبول ہے۔ مغربی لباس استعمال کرنے والوں کو خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ یہ لوازمات پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔

وزارتِ مالیات کے دور ہی میں ان کی صحت کمزور ہوگئی تھی اور ان کے ذہن میں پھر یہ خیال پیدا ہوگیا

کہ اگر جسم اور ذہن کی پوری توانائیوں سے فرائض منصبی کی تکمیل نہیں ہوتی تو حلال روزی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سے سبکدوشی حاصل کر لی جائے۔ چناں چہ حضور نظام سے دو تین بار سبکدوشی کی اجازت چاہی۔ نظام نے انہیں اس اقدام سے روکنے کے لیے غیر معمولی مراعات دیں جن میں دو برس تک وزارت کا کام پونا سے قریب ایک صحت افزا مقام پر انجام دینے کی رعایت شامل تھی۔ بالآخر ان کے بار بار کے اصرار پر نظام نے سبکدوشی کی اجازت دے دی۔ مادہ پرستی کے اس دور میں ایک اعلیٰ عہدہ سے بہ اصرار علیحدگی اختیار کرنا ایک عجوبہ سے کم نہیں تھا مگر یہ اقدام ان کی فطرت کے عین مطابق تھا اور ان کے ضمیر کی آواز تھی۔

ملازمت چھوڑنے کے بعد اعصابی فالج کی صبر آزما بیماری نے اور زور پکڑا تا آنکہ وہ نقل و حرکت کے بھی قابل نہ رہے۔ حیدر آباد کے سقوط کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور یہاں سات برس تک بیماری اور انتہائی نقاہت کے عالم میں گزارا صبر و توکل ان کی سرشت میں تھا۔ وہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ کبھی اف تک نہیں کی۔ ہر بات میں اور ہر حال میں راضی برضا رہے۔ ۱۱ر ذوالحجہ ۱۳۷۵ھ کو صبر و تحمل کی تصویر بنے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور شہر لاہور میں جہاں انھوں نے اپنی فعال زندگی کا آغاز کیا تھا ابدی نیند سو گئے۔ یہ تھے فخر الدین احمد فخر یار جنگ شریعت کے پابند، عشقِ رسولؐ سے سرشار، اپنے دنیاوی مرتبہ کی بلندی کے احساس سے خالی، دنیا میں رہ کر دنیا سے بیزار، مجھے اس عظیم بزرگ کی ذات سے بے حد فیض حاصل ہوا اور ان کی خدمت میں ساری عمر حاضری کا شرف حاصل رہا وہ اس لیے کہ وہ ایک عظیم شخصیت ہی نہیں تھے وہ میرے والد محترم بھی تھے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین)